گفتگو

# ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو
# اور
# عالم اسلام

محمد حسین مظفری

انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے بعد اہل مغرب کے ذہن میں مذہب اسلام کی تصویر کافی طاقتور دکھائی دینے لگی ہے۔ یہ تصویر بالکل بناوٹی اور ان کی خود ساختہ ہے اور اس کو علمی مراکز، یونیورسٹیوں اور وسائل ابلاغ کی حمایت حاصل ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ آج لفظ اسلام سنتے ہی اہل مغرب کا ذہن جہاد، دہشت گردی، خون خرابہ، قتل وغارتگری، نسل پرستی، خواتین پر ظلم وستم اور انسانی حقوق کی پامالی جیسے مفاہیم کی طرف خود بخود متوجہ ہوجاتا ہے۔ درحقیقت مغربی دنیا میں واقع یونیورسٹیوں اور علمی وتحقیقی مرکزوں میں سیاسی اور سماجی علوم کے ماہرین بھاری بجٹ اور سرمایہ کے ساتھ ہمہ تن سرگرم ہیں تاکہ ان امور کے سلسلے میں کوئی محققانہ اصول ونظریہ قائم کرسکیں۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دنوں مغرب میں علمی و دینی ودانشگاہی مراکز میں دیگر ادیان ومذاہب کی تردید وتکذیب کا بازار گرم ہے اور اکثر سیاسی ماہرین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک رقیب سیاسی طاقت کی حیثیت سے مغربی دنیا کی بنیادی قدروں کے لئے ایک بڑا خطرہ بن گیا ہے۔

دوسری طرف، سرد جنگ کے اختتام اور آزاد خیال مغربی جمہوریت کے مشترکہ دشمن کے اضمحلال کے بعد یہ پریشانی اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ ایک مشترکہ دشمن کی ناموجودگی کی وجہ سے ممکن ہے کہ مغربی دنیا کا اتحاد خطرہ میں پڑجائے اور ایک رقیب کے نہ ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب کی ترقی اور ہمہ گیریت کی رفتار سست اور اس کے زوال کا سلسلہ شروع ہوجائے۔ اسی وجہ سے ''تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ'' کو نہ صرف ایک علمی نظریہ بلکہ ''جدید عالمی نظام'' کی تشکیل پر مبنی عملی منصوبہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کیونکہ ایک طاقتور سیاسی رقیب کے نہ ہونے کی صورت میں حقیقی دشمن کو

''سبز خطرہ'' اور ''اسلامی دھمکی'' کو زیادہ سے زیادہ بڑھا چڑھا کر اور زیادہ نمایاں انداز میں پیش کرنا ہی چاہئے تاکہ مغربی تہذیب کی وحدت ویگانگت اور بالادستی وترقی وتیز رفتاری پوری طرح محفوظ رہ جائے۔

پس دنیا کے اکثر مصلحین ومفکرین اپنی نیک نیتی کی وجہ سے اس دھمکی کو خیالی اور غیر واقعی ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں اہل مغرب نے جو نظریہ قائم کررکھا ہے وہ بالکل غلط اور غلط فہمی کی بنیاد پر ہے۔ یہ خیر اندیش مفکرین اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ مغربی دنیا اس غلط فہمی کی سخت محتاج ہے کیونکہ ۲۱ ویں صدی میں پوری دنیا پر مغربی تسلط اور غلبہ کا راز اسی غلط فہمی میں مضمر ہے۔

'' اختتام تاریخ'' فوکویاما اور ہنٹنگٹن کے ذریعہ پیش کئے گئے'' تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ'' جیسے نظریہ سے لیکر ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ کو نیو یارک میں واقع عالمی تجارتی مرکز کی عمارت پر ہونے والے حملات اور بم دھماکوں تک جو حوادث منظر عام پر آئے ہیں وہ درحقیقت ایک ہی منظر کی مختلف جھلکیاں اور ایک عملی منصوبہ کے مختلف مراحل کی حیثیت رکھتے ہیں ہیں جن کا بنیادی مقصد مغربی تہذیب کو زوال ونابودی کے خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر اتفاقاً یہ تجزیہ درست ثابت ہوجائے تو پھر تلخ سیاسی مسکراہٹوں کے ساتھ آئے دن منعقد ہونے والے یہ اجتماعات واجلاس صرف ایسے محفل مغازلہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو بھیڑیا اور بھیڑ (بھینس) کے درمیان انجام پاتا ہے اور جس عاشقانہ گفتگو کے دوران خونخوار بھیڑیا معصوم بھیڑوں اور بکریوں کی ادیبانہ توصیف وتعریف پیش کرتا ہے اور دوسری معصوم بکری سامنے موجود بھیڑیے کو یہ باور کرانے میں لگی رہتی ہے کہ دیکھو میرے تو سینگ بھی نہیں نکلی ہے اور اگر اس کی کوئی علامت دکھائی دیتی ہے تو اس کا مقصد محض دفاعی ہے اور فقط ذاتی مجاہدہ کے لئے ہی اس کو استعمال کرتا ہے۔ افسوس کہ اس زمانہ میں عبید ذاکانی جیسا مزاحیہ شاعر موجود نہیں ہے جو اس عاشقانہ مکالمہ کو اپنے قصیدہ میں جگہ دے۔

سردست جو مسلمان مفکرین شریعت کو عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ قرآن مجید میں موجود آیات جہاد کو''جہاد نفس''یا''دفاعی جہاد'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جس کو مغربی دانشور طبقہ والے معذرت آمیز روش (appologetic approach) قرار دیتے ہیں اور ان مصلحانہ کوششوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ لیکن اگر آج کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مغرب کا

یہ احساس خطر درحقیقت دین اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب سے ان لوگوں کی نا واقفیت کی وجہ سے ہے تو ایسی صورت میں ادیان ومذاہب اور فرہنگ وتمدن کے درمیان گفتگو ضروری ہوجاتی ہے تاکہ اس وحشی کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے مسلمانوں کو مہلک خطروں سے محفوظ رکھا جاسکے۔

## ادیان کی گفتگو کا تاریخی پس منظر

اسلام اور عیسائیت کے درمیان گفتگو کا خیال ۱۹۲۳ میں پیدا ہوا۔ حکومت فرانس نے اپنے کچھ نمائندوں کو الازہر یونیورسٹی، مصر بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ ابراہیمی ادیان کے درمیان وحدت واتحاد قائم کرنے کے لئے ایک عالمی کانفرنس تشکیل دی جائے۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ میں پیرس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ترکی، اسپین، پولینڈ، اٹلی، امریکہ، سوئٹزر لینڈ، برطانیہ اور فرانس کی یونیورسٹیوں سے وابستہ مبلغین اور ماہرین علوم شرقیہ نے شرکت کی تھی۔ دوسری عالمی جنگ سے قبل ۱۹۳۶ میں ایک ادیان کانفرنس منعقد ہوئی اس کے بعد ادیان کے درمیان مذاکرہ کا دوسرا مرحلہ ۱۹۶۴ میں شروع ہوا جس میں پوپ پالس ششم کا پیغام بھی پیش کیا گیا جس میں انھوں نے مختلف ادیان ومذاہب کے ماننے والوں کو گفتگو کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کے بعد ۱۹۶۹ میں واٹیکن شہر سے ایک کتاب بھی شائع ہوئی جس کا عنوان تھا'' عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان گفتگو کے بنیادی اصول''۔ ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائیوں کے درمیان ادیان ومذاہب اور فرہنگ وتمدن کے درمیان گفتگو پر مشتمل تیرہ اجلاس منعقد ہوئے جن میں سب سے زیادہ اہم'' دین اور صلح'' عنوان کے تحت منعقد ہونے والا دوسرا عالمی اجتماع ہے جو بیلجیم میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مختلف ادیان ومذاہب کے ۴۰۰ سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی تھی۔ دوسرا اہم اجتماع قرطبہ کانفرنس کے نام سے ۱۹۷۴ میں اسپین میں منعقد ہوا تھا جس میں ۲۳ عیسائی اور اسلامی ملکوں کے مندوبین موجود تھے۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ میں ٹونس (Tunisia) کے قرطاج نامی علاقے میں ایک اسلامی۔ عیسائی اجلاس منعقد ہوا تھا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۹۳ میں جارڈن میں عرب اور یورپی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ میں شہر خرطوم میں ادیان کانفرنس ہوئی۔ پھر ۱۹۹۵ میں دو ادیان کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی۔ ان میں سے ایک سویڈن کے اسٹاک ہوم میں اور دوسری جارڈن کے عمان نامی شہر میں منعقد ہوئی۔ اس

کے بعد بھی جارڈن میں آل البیت یونیورسٹی میں ۱۹۹۶ میں اسلامی ویورپی ملکوں کے درمیان ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔

اسلامی وعیسائی مذاکرات کا دسواں دور ۲۸ لغایۃ ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۲ میں بحرین میں منعقد ہوا جس میں فقط علماء ہی نہیں بلکہ تحریک مذاکرہ ادیان سے جڑی ہوئی بعض عظیم شخصیتوں نے بھی بھرپور شرکت فرمائی۔ان سبھی کانفرنسوں کے انعقاد کا اہم ترین مقصد اور بنیادی سبب یہ تھا کہ ادیان کے درمیان اس گفتگو کی وجہ سے باہمی تال میل پیدا ہوجائے اور کمیونزم کے ذریعہ تمام مذاہب کو جو خطرہ محسوس ہورہا تھا وہ زیادہ موثر ثابت نہ ہو۔سبھی ادیان کی پیروی کرنے والوں نے یہ ضروری سمجھا کہ کفروبے دینی کے مدمقابل اقدام کرنا لازمی ہے اور اس کام کے لئے ایک مشترکہ محاذ کی تشکیل زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

## مقاصداور کامیابیاں

ہم لوگ جس دنیا میں زندگی بسر کررہے ہیں وہ ''عالمی'' خصوصیات اوردیگر مختلف پہلوؤں کی حامل ہے۔چنانچہ مالی اور صنعتی شعبوں میں ہم ''عالمی تجارت'' اور ''عالمی اقتصاد'' کی بات کرتے ہیں اور سیاست کے میدان میں ''عالمی حکومت'' اور ''عالمی برادری'' کی اصطلاح رواج پاچکی ہے۔فوجی شعبہ میں بھی ''عالمی محافظین صلح'' جیسی عبارت اور علاقائی وعالمی سطح پر باہمی اتحادعصری ضرورت کا رنگ و روپ اختیار کرچکی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کے دیگر شعبوں کی طرح مذہب نے بھی عالمی حیثیت اختیار کرلی ہے۔اگر چہ عالمی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے مختصر سے حصے نے ادیان و مذاہب کو ایسے بے مثال مواقع فراہم کردئے ہیں جس کو استعمال کرتے ہوئے ادیان ومذاہب کی سعادت آمیزی کو بڑی آسانی سے ساری دنیا تک پہونچا یاجاسکتا ہے لیکن اس کے بعض حصے مذہبی معاشرہ کی پریشانی کا باعث بن گئے ہیں۔

۱۱ر ستمبر کو رونما ہونے والے حملات کے گہرے سایہ اور دنیا پر چھائی ہوئی جنگی فضا میں ۴ اور ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ کو اسلام اور عیسائیت سے وابستہ ایک اجلاس روم میں منعقد ہوا جس میں عالم اسلام کی عظیم مذہبی اور علمی شخصیتوں کے علاوہ نامور مسلم دانشوروں نے بھی شرکت کی جیسے مفتی مصر نصر فرید واصل،شیخ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر احمد کمال ابو المجد ،مصری ماہر قانون ڈاکٹر محمد سلیم العواء، ڈپٹی چیف

ایڈیٹر الاحرام اور یونیورسٹی پروفیسر فہمی ہویدی، شیخ زائد بن سلطان کے ثقافتی مشیر عز الدین ابراہیم، تنظیم اسلامی کانفرنس کے سکریٹری ڈاکٹر عبد اللہ نصیف، مورٹیا نا کے سابق ثقافتی وزیر ڈاکٹر محمد ولد، الجزائر کے سابقہ وزیر خارجہ احمد طاہر ابراہیمی اور دیگر علماء کرام وغیرہ۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبد المجید نے اعلان کیا کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں اب تک سیکڑوں اجلاس منعقد ہو چکے ہیں جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی اور ان اجلاس میں مختلف تمدنوں کے درمیان اور فوری اور لگا تار گفتگو پر کافی زور بھی دیا گیا۔ ان اجلاس کے دوران مذاہب اور تمدنوں کے درمیان مشترکہ پہلوؤں کی نشاندہی بھی ہوئی تھی لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ ۱۱ ستمبر کو رونما ہونے والے حوادث کی وجہ سے ان کامیابیوں کا بالکل خاتمہ ہو جائے اور دنیا پھر مقام صفر پر واپس آجائے۔ حالانکہ ان دھماکوں سے قبل تنظیم اقوام متحدہ کی جانب سے ایک دستاویز تیار کیا جا چکا تھا جس کی روشنی میں ایک ایسی خصوصی تنظیم کی تشکیل ہونی تھی جو تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تقویت وحمایت کا کام انجام دیتی۔ ان اجتماعات کے دوران بہت سی تجاویز منظور ہوئیں۔ ذیل میں بعض سفارشات کا خلاصہ حاضر خدمت ہے۔

۱۔ توحیدی اور ابراہیمی ادیان کے درمیان مشترک پہلوؤں بالخصوص عقیدہ واخلاق و ثقافت کی شناخت اور ادیان وثقافتوں کے درمیان لازمی پہلوؤں پر تاکید۔

۲۔ حکومتوں کی سیاست اور قوموں کی ثقافت سے دشمن کے مفہوم کو پوری طرح نابود کرتے ہوئے ادیان ومذاہب کے درمیان باہمی صلح آمیز زندگی کی تشکیل کے لئے انسانی حقوق کے معیار پر مشترک میثاق کی تدوین۔

۳۔ بغض وکینہ اور عداوت ودشمنی کو حذف کرنے کے لئے تاریخ اور تعلیمی نظام پر نظر ثانی اور دینی تعلیمات کے لحاظ سے ایسے انسانی اور اساسی علوم کی تقویت جس کے ذریعہ صبر وتحمل اور مشترکہ تفاہم کو فروغ حاصل ہو سکے۔

۴۔ بعض موضوعات کا اہتمام اور درج ذیل عناوین کے سلسلے میں مشترک نتائج اور مفاہیم تک رسائی حاصل کرنا: عدالت، صلح، عورت، انسانی حقوق، جمہوریت، اخلاق کار، کثرت گرائی، آزادی، عالمی صلح، باہمی صلح آمیز زندگی وغیرہ۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ سرد جنگ کے دوران ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کمیونزم سے مقابلہ کے لئے نہایت ضروری تھی لیکن سوویت یونین کے بکھراؤ اور سرد جنگ کے اختتام کے بعد دین ومذہب نے عالمی سطح پر اہم کردار ادا کیا ہے اور

ثقافتی ، سیاسی اور سماجی شعبوں میں یہ کردار زیادہ موثر رہا ہے۔ آخر کار ایک اہم عالمی سیاسی ادارہ کی حیثیت سے تنظیم اقوام متحدہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ عالمی اقتصادی اجتماع کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی رہنماؤں کا بھی ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کیا جائے تا کہ عالمی سطح پر ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو ہو سکے۔ اس بین الاقوامی کانفرنس کے ۱۳ رکن تھے جس میں دنیا کے مختلف ادیان اور مکاتب فکر کے لوگوں کو نمائندگی حاصل تھی اور مذہب اسلام کی نمائندگی اسلامی جمہوریہ ایران اور انڈونیشیا کے سپرد تھی۔

اگست ۲۰۰۰ میں اقوام متحدہ میں یہ طے پایا کہ عالمی مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ بلند مرتبہ سیاسی لیڈروں کے ساتھ ہی ساتھ عظیم المرتبت مذہبی علماء کا بھی ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد ہوتا کہ مذہبی اور سیاسی علماء وماہرین باہمی گفتگو کے ذریعہ مسائل ومشکلات کا حل تلاش کرسکیں اور عالمی انسانی برادری امن وسلامتی اور مسرت وخوشحالی کی زندگی بسر کرسکے۔ موجودہ دنیا میں دین ومذہب وسیاست کے میدان میں اہم اور قابل ذکر کردار ادا کررہا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کا مشترکہ خیال ہے کہ سبھی لوگ ایک طوفان زدہ کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں لہٰذا سب لوگوں کو مشترکہ کوشش اور مذاہب کے درمیان موجود مشترکات پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگ اور لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہوئے اس کشتی کو ساحل نجات تک پہونچادیں۔

۱۹۶۴ میں واٹیکن شہر میں منعقد ہونے والے دوسرے اجتماع کے دوران کتھولیک چرچ نے مذہب اسلام کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ اسلام اور کیتھولک عیسائیت کے درمیان گفتگو کی پہلی کرن تھی۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان موجود زیادہ مشترکات نے گفتگو کی زمین کو مزید ہموار کر دیا تا کہ وہ مغربی سامراج اور عیسائی مشینریوں کی حمایت سے رونما ہونے والی تلخ یادوں اور مخاصمانہ احساس پر غلبہ حاصل کرسکیں۔

واضح رہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان بہت سی مشترک باتیں پائی جاتی ہیں جیسے خدائ خالق پر عقیدہ وایمان ، انبیاء علیہم السلام کا خدا کی طرف سے ارسال کیا جانا، وحی پر اعتقاد اور روز قیامت وروز عدل پر اعتقاد وایمان وغیرہ۔ اسی طرح اسلام اور عیسائیت کے درمیان جن چیزوں میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں۔ تثلیث کا مفہوم ، جو عیسائی الٰہیات میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسلام کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا مسلمانوں کے لئے قابل قبول

نہیں ہے۔ دوسری طرف عیسائیت یہ تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے کہ قرآن آخری کلام الٰہی ہے اور اس کو دیگر آسمانی کتابوں پر فضیلت حاصل ہے۔

## تیسری بات

اگر چہ گذشتہ تین دہائیوں کے دوران اس قسم کے اجتماعات میں ہونے والے روز افزوں اضافہ کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے لیکن عالم اسلام میں اس موضوع کے سلسلے میں ایک رائے اور ہم خیالی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس کے بارے میں مسلمان مفکرین کے درمیان استقطاب یعنی قطب خواہی (Polarisation) اور محاذ سازی وگروہ بندی کا مشاہدہ کیا جاچکا ہے اور اس میدان کے ایک قطب میں مخالفین کے ساتھ گفتگو نہ کرنے کا محاذ آمادہ ہو چکا ہے۔ مخالفین کی ایک جماعت کا عقیدہ وایمان ہے کہ ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کی تحریک نسبیت کی فکر کی بنیاد پر سربلند ہوئی ہے اور دین مبین اسلام کی حقانیت مطلقہ اور ایمان وعقیدہ کے ساتھ ہرگز میل نہیں کھاتی ہے۔ دوسرے گروپ سے وابستہ مفکرین ودانشور اس تحریک کے بنیادی اصول سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس خیال کے حامل ہیں کہ ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کی حمایت وطرفداری کرنے والے لوگ اپنی دعوت میں صداقت نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس تحریک کے ذریعہ اپنے سیاسی اور سامراجی مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔ دوسری طرف ادیان کے درمیان گفتگو کی حمایت کرنے والوں نے علیحدہ موقف اختیار کررکھا ہے۔ مفکرین اور دانشوروں کی یہ جماعت اس عقیدہ کی حامل ہے کہ حقیقت کی تلاش کے سلسلے میں مغرورانہ ٹھہراؤ اور اپنے موقف پر اڑے رہنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ آخرکار مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شک وتردید کی ترویج کے اس دور میں علماء دین ادیان کا تاریخی مطالعہ وتجزیہ کرتے وقت تواضع اور انکساری کی بنیاد پر اپنی دینی معلومات کی تردید کریں اور اسے ہرگز آخری اور قطعی معلومات قرار نہ دیں کیونکہ دین کی بنیاد اور دین کے پاکیزہ ومقدس متن سے اپنی معرفت کے درمیان فرق وعلیحدگی کی وجہ سے ان لوگوں نے دین کی حقیقی قداست وپاکیزگی کو اپنے لئے حرام کررکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انسانی عقل کی محدودیت وکوتاہی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حقیقت سے مکمل ناواقفیت کا اعتراف بھی کررکھا ہے۔ اس مقالے میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ عالم اسلام کے نامور مفکرین اور دانشوروں نے ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کے سلسلے میں جو

راہ وروش اختیار کر رکھی ہے اس کا مکمل اور بھرپور تجزیہ پیش کرتے ہوئے نتیجہ قارئین کے سپرد کردیا جائے۔

## منفی راہ وروش

ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کے سلسلے میں منفی راہ وروش رکھنے والے مسلمان علماء کا یہ عقیدہ وریمان ہے کہ اس موضوع پر منعقد کئے جانے والے عظیم اجتماعات کا بنیادی مقصد اسلامی معاشروں پر مغربی قدروں اور نمونوں کو مسلط کرنا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کی مذہبی حمیت اور ذہنی لگن کو زائل کرسکیں۔ واضح رہے کہ مختلف ادیان ومذاہب کے درمیان مشترکات کی شناخت کے ذریعہ موجودہ حقائق کو بالکل نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا۔

## خفیہ مقاصد

مذاہب کے درمیان گفتگو ایسا اہم موضوع اور ایسی اہم تحریک ہے جس کے مراکز ومیلانات اور اغراض ومقاصد کے بھرپور مطالعہ وتجزیہ کے بغیر کوئی حتمی فیصلہ ناممکن ہے اور اس سلسلے میں صرف تحریک کی جانب سے اعلان کئے گئے اغراض ومقاصد پر بھروسہ کرنا یقیناً سادہ لوحی ہوگی بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ تحریک کے خفیہ اور اعلان نہ کئے گئے اغراض ومقاصد کا بھی جس میں مذہب کے ذریعہ سیاسی واقتصادی کامیابی کا حصول شامل ہے، باقاعدہ مطالعہ وتجزیہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر جب مسئلہ فلسطین کے حل کے سلسلے میں تمام سیاسی اور اقتصادی ایجادات ناکام ہوگئیں تو ادیان و مذاہب کے نمائندے ایک علاقے میں دوبارہ جمع ہوکر ''مسئلہ دہشت گردی'' کے تجزیہ وحل وفصل میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے اسرائیل میں عربوں اور صہیونیوں کے درمیان صلح کو جائز اور قانونی بنانے کے لئے مختلف ادیان ومذاہب کے نمائندے صحرای سینا میں ''کوہ طور'' پر جمع ہوئے تھے۔

پس یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ایجاد کن پہلوؤں کی حامل ہے اور اپنے دامن میں کیسے کیسے اغراض ومقاصد چھپائے ہوئے ہے اور دہشت گردی کی آڑ میں خفیہ مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ درحقیقت اس کا ایک مقصد ''شہادت طلب سرگرمیوں'' کو ظلم ودہشت گردی کے نام سے متعارف کرانا ہے تاکہ ''عام شہریوں کی حمایت'' کے بہانے صہیونیت کے ظالمانہ تسلط اور غاصبانہ قبضہ کو جاری رکھا جاسکے۔ واضح رہے کہ دین ایک لمبی مدت سے سیاسی اور سماجی میدان سے دور

اور باہر رہا ہے اور اب اس کو دوبارہ میدان میں لاکر کھڑا کیا جارہا ہے اس مرتبہ مذہب سیاسی مقاصد کی تکمیل میں غیر معمولی حمایت وطرفداری کی نیت سے میدان میں داخل ہوا ہے۔

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ یہ گفتگو اسلامی اور عیسائی دینی اداروں کے ذریعہ منعقد کی جارہی ہے لہٰذا ان کے مقاصد کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی نہ رکھنی چاہئے۔ لیکن اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ عالم اسلام کے دینی ادارے حکومتوں کے زیر سایہ کام کررہے ہیں۔ اگر بفرض محال کسی ملک میں کوئی ایسا ادارہ مل جائے جو حکومت کے دباؤ سے دور آزادانہ طور پر کام کررہا ہے تو اس ادارہ کے لئے بھی یہ بات بہت دشوار ہوگی کہ وہ حکومت یا مخصوص سیاسی واقتصادی مقاصد کے لئے کام کرنے والے اداروں کی حمایت وسرپرستی کے بغیر کسی علاقائی یا بین الاقوامی اجتماع کی تشکیل کا کام انجام دے سکے بلکہ اس کے برعکس عالمی یا علاقائی سطح پر کسی اجتماع کے اہتمام کے لئے کسی نہ کسی حکومتی یا بیرونی ادارہ کی حمایت حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے یہاں تک کہ مغربی دنیا کے ادارے بھی، جہاں سیکولر نظام حکومت کارفرما ہے، سیاسی سرگرمیوں سے الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہملوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ مغربی اور عیسائی دنیا کی اہم ترین مذہبی شخصیت پوپ عالمی مسائل وموضوعات میں اہم سیاسی کردار کے حامل رہے ہیں مثلاً انھوں نے جرمنی نازیوں کے خلاف یہودیوں کے مطالبہ کی بھرپور تائید فرمائی اور یہ کیتھولک گرجاگھروں (Catholic Church) کا ہی کرشمہ تھا جس نے پولینڈ کے مزدوروں کو مسند اقتدار تک پہونچادیا۔ لہٰذا جب کمیونزم کے مقابلے میں جملہ مغربی نظام پوری طرح عاجز وناکام ہوگئے تو انھوں نے عیسائی مذہب کو اشتراکیت کے خلاف ایک اہم وسیلہ وذریعہ کے طور پر استعمال کیا اور اسی طرح سوویت یونین کو شکست دینے کے لئے اسلام سے اپنی دیرینہ عداوت کو ایک موثر اسلحہ کی حیثیت سے استعمال کیا۔

## تحریک کی کامیابیاں

اگر ہم اس تحریک کے خفیہ مقاصد کی طرف سے چشم پوشی بھی اختیار کرلیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تحریک نے گذشتہ دہائیوں کے دوران کیا کامیابی حاصل کی ہے؟ اگر ہم لوگ سیاسی کامیابیوں کو نظر انداز کردیں اور صرف دینی ومذہبی کامیابیوں کو نگاہ میں رکھیں تو ہمیں یہ کہنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہئے کہ ان اجتماعات کی تشکیل سفارتی تکلفات اور بڑی بڑی شخصیتوں کے

درمیان ذاتی کارڈوں کے تبادلہ کی حد تک ہی محدود رہی اور نہ کسی قسم کا کوئی مقصد حاصل ہوسکا اور نہ کسی شعبہ میں ذرہ برابر کامیابی محسوس ہوئی۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آزاد مذہبی فقہا اور دینی مراجع جہاد اور قانونی وشرعی دفاع کے سلسلے میں اپنی رائے تبدیل کردیں اور ظلم کو قبول نہ کرنے والی انسانی زندگی کے بنیادی حق سے دستبردار ہوجائیں۔ دوسری طرف یہودی ماہرین، جو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ''شہادت پسندانہ عمل'' مذہبی علماء اور رہنماؤں کے فتوے کے بموجب ہی انجام پارہا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ اس کوشش میں ہمہ تن سرگرم ہیں کہ مخالف جماعت کے ہاتھوں سے اس کی کامیابی کا وسیلہ چھین لیں۔ عیسائی مذہبی رہنما عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کے لئے یہ مظاہرہ کررہے ہیں کہ وہ صلح اور انسان دوستی کے طرفدار ہیں اسی وجہ سے وہ مسلمانوں کی دہشت گردی وہٹ دھرمی اور یہودیوں کے غاصبانہ تسلط دونوں کی مخالفت کرتے ہیں۔

## فراماسونری تحریک کا کردار

مجموعی اعتبار سے آج تحریک گفتگوی ادیان کی جانب سے جس عالمی دین کی تبلیغ وترویج ہورہی ہے اس کی تالیف وتدوین کا کام فراماسونری انجمنوں کے ذریعہ انجام دیا گیا تھا۔ دراصل ان لوگوں کا یہ اعتقاد وایمان تھا کہ مختلف ادیان ومذاہب میں مشترکہ اخلاقی اور معنوی پہلوؤں کی دستیابی کے ذریعہ ایک طرح کے ''عالمی اخلاق'' کو دین ومذہب کا جانشین قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ ادیان کی حقانیت مطلقہ مذہبی تعصب میں شدت اور اضافہ کا باعث بن جاتی ہے جبکہ مشترکہ معنوی قدروں اور معیاروں کے حصول نیز ''عالمی اخلاق'' وادیان کے درمیان موجود مشترکہ معنوی پہلوؤں کے ذریعہ ''عالمی صلح'' کے بنیادی اصولوں کو مزید مستحکم کیا جاسکتا ہے۔'' موثر اور سرگرم انجمنیں اس فراماسونری اور تھیوسوفی فکر کی ترویج میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔ فراماسونی راہ وروش کے سایہ میں ''عالمی دین'' کی خاطر مذہبی جزبۂ صبر کو یہ لوگ ایک اکسیر کی شکل میں پیش کرتے ہیں تاکہ اس نظریہ کے تحت وہ دنیا کے تمام افراد وادیان کو اس میں شرکت کی دعوت دے سکیں۔ درحقیقت فراماسونری انجمن کی بنیاد ہر دین ومذہب کے سلسلے میں سہل انگاری پر مبنی ہے۔ فراماسونی لوگ ایسے دین ومذہب کے معتقد ہیں جس پر پوری انسانی دنیا متفق ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادیان ومذاہب کے اختلافی مسائل کو یہ لوگ متعلقہ دین کی پیروی کرنے والوں

کی ذات سے وابستہ کردیتے ہیں۔ اس عقلی سقف کے سایہ میں تمام مذاہب مثلاً عیسائیت یہودیت، اسلام اور برہمنیت کی پیروی کرنے والے مشترکہ اصولوں کی پیروی کے ساتھ جمع ہوسکتے ہیں اور ان کے درمیان اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ راہ وروش ہے جس کے ذریعہ فراماسونری افراد صرف اصولی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ عملی اعتبار سے بھی عالمی رنگ و روپ حاصل کرلیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی فرق وامتیاز نہیں ہے کہ فلاں شخص زرتشتی ہے یا مسلمان یہودی ہے یا بودائی اور ہندو ہے یا عیسائی کیونکہ مشترکہ مفاہیم دینی پر غیر معمولی تاکید کے ذریعہ تمام ادیان ومذاہب کے درمیان وحدت واتحاد کی ایجاد ممکن ہے۔

فراماسونری تحریک ایسے مکتب فکر کی حامل ہے جو تمام ادیان ومذاہب کو ایک دوسرے سے متحد کرسکتا ہے۔ Theosophical Association بھی فراماسونری تحریک کی مشابہ ہے جو ''عقلانی دین'' کی تبلیغ کرتی ہے اور اس انجمن میں بھی مذاہب کے درمیان مشترکہ قدروں اور معیاروں پر تاکید کی جاتی ہے اور اس کی اہم ترین بنیاد ''عالمی وآفاقی وحدت'' کی تشکیل ہے۔ اس فرقہ کے بانی کی وفات کے بعد اسکے جانشین بھی ادیان کے درمیان گفتگو کی روش پر تاکید کرتے ہیں۔ اس گروہ کے لیڈران آج ساری دنیا میں ادیان کے درمیان گفتگو پر مبنی مفاہیم کی ترویج واشاعت میں عملی کردار ادا کررہے ہیں اور ان کے نمائندے ادیان کی عالمی پارلیمنٹ میں شریک تھے جو ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۹ میں منعقد ہوئی تھی ۱۸۹۳ میں جب ادیان کی پہلی عالمی پالیمنٹ منعقد ہوئی تھی نیز ۲۰۰۱ میں ''ادیان اور گفتگو'' کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں یہ لوگ پوری طرح سرگرم عمل تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ۲۰۰۴ میں پارسیلونا والی کانفرنس میں ان لوگوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ پس یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ ''تحریک گفتگوادیان'' اور ''فراماسونری'' ادبیات کے درمیان غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے اور دونوں مشترکہ افکار وعقائد کی تبلیغ وترویج میں لگی ہوئی ہیں۔ تمام انسانوں کے درمیان عالمی اخوت وبرادری universal brotherhood، خدا تمام انسانوں کا پدر اور ۱۸۹۳، ۱۹۹۳ اور ۱۹۹۹ میں عالمی ادیان پارلیمنٹ کے دوران عالمی وحدت واتحاد جیسے مفاہیم کی تبلیغ ہوئی اسی طرح گذشتہ بیسویں صدی کے دوران گفتگوی ادیان سے متعلق جو اجلاس واجتماع منعقد ہوئے ان میں انھیں مفاہیم کی ترویج کی گئی۔ ایران میں بھی گمراہ فرقۂ بہائیت کے ذریعہ ان افکار وعقائد کی ترویج کی گئی بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایران میں موجود مذہبی اور ثقافتی ماحول کا ناجائز استعمال کرتے

ہوئے فراماسونری تنظیم نے اپنے افکار وعقائد کو ایرانی رنگ وروپ میں بہائیت کی شکل پیش کر دیا تا کہ اس کو ایرانی تحریک کا نام حاصل ہوجائے۔ واضح رہے کہ مذہب بہائیت کے افکار وعقائد اور فراماسونری ادبیات کے درمیان بڑی مشابہت ومماثلت پائی جاتی ہے بلکہ اگر ماضی قریب میں مذہب بہائیت پر ''عالمی برادری'' کا اشتہار چسپاں کردیا جاتا تو مذہب بہائیت کی فراماسونری افکار سے وابستگی پوری طرح نمایاں ہوجاتی۔ ۱۹۱۱ سے ۱۹۱۳ کے دوران عباس آفندی کا یورپ اور امریکہ کا سفر اتفاقی نہیں بلکہ ایک منصوبہ بند پروگرام کے مطابق تھا۔ اگر اس سفر اور ان اجتماعات کا جن میں عباس آفندی موجود تھے محققانہ تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بلکہ اس میں مقتدر مراکز سرگرم عمل تھے جن کی کوشش یہ تھی کہ سرزمین مشرق میں رونما ہونے والے اس نئے پیغمبر کے ذریعہ ایک نئے مذہب کے ظہور رونمائش کی زمین ہموار ہوجائے جو فراماسونی اور تھیوسوفستک ارمانات کے مطابق ہو۔[1]

اس محققانہ تجزیہ کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ نمائشی پروگرام در حقیقت World Theosophicul Society یعنی عالمی تھیوسوفیکل انجمن کے ذریعہ بنایا گیا تھا جو عظیم مغربی فراماسونی تنظیم کی ہدایت ورہنمائی میں سرگرم عمل ہے۔ اس سفر کے دوان عباس آفندی کو تھیوسوفزم کے ایک عظیم المرتبت رہنما کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ یہ پروپگنڈہ اتنے وسیع پیمانے پر کیا گیا کہ ملکہ روم اور اس کی بیٹی ژولیا نے بھی عباس آفندی کو ایک عظیم مذہبی رہنما تسلیم کرلیا اور اسی عہدہ وعنوان کے ساتھ اس سے خط وکتابت بھی کی۔[2] صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ۲۰۰۴ میں اس تبلیغاتی مشن سے وابستہ لوگوں نے ادیان ومذاہب کے عالمی اولمپک کا اہتمام کیا اور گذشتہ عالمی اجتماعات کی طرح اس میں بھی دنیا کے گوشہ گوشہ سے مختلف مذاہب کی پیروی کرنے والے دانشوروں اور سیاسی ماہروں نے شرکت کی تا کہ عالمی سطح پر ایک سیاسی اور مذہبی نظام کی بنیاد رکھی جاسکے۔ یہ عظیم اجتماع عالمی ادیان کی پارلیامنٹ کی جانب سے یونسکو مرکزی دفتر کا ٹالونیا میں منعقد ہوئی۔

## اصول کی خلاف ورزی

بعض مسلمان مفکرین اور دانشوروں کا عقیدہ وایمان ہے کہ یہ افکار وخیالات درحقیقت اسلام کی حقانیت

---

۱۔ شہبازی، عبداللہ، ''کانون بہائی گری در حجرہ تاجران تریاک''، جام جم، ۱۲ مرداد ۱۳۸۲، ص ۱۳، ۲۔ ایضاً

اور اس کے بنیادی اصول سے میل نہیں کھاتے ہیں۔ اس سلسلے میں تحریک سلفیہ کے مفکروں نے سخت ترین استدلال پیش کئے ہیں۔ سلفی تحریک اہلسنت کی فکری شاخوں میں سے ایک ہے جس نے موجودہ دنیا کے سیاسی تحولات پر اہم اثرات قائم کئے ہیں اور خصوصی طور پر آخری دہائیوں کے درمیان الجزائر مصر اور افغانستان جیسے ملکوں کے علاوہ عالم اسلام کے دیگر علاقوں میں رونما ہونے والی اکثر سیاسی تحریکیں تحریک سلفیہ سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ اس تحریک کی فکری روش نہایت وسیع اور واضح فقہی اصولوں میں مضمر ہے۔ سلفی تحریک سے وابستہ مسلمان مفکرین انسان کی ذاتی عظمت وکرامت پر مکمل عقیدہ وایمان رکھتے ہیں اور انسان کی یہ ذاتی کرامت وفضیلت ہی انسانی حقوق کے بنیادی اصول کا تعین کرتی ہے۔

مرد مومن حق کرامت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ انسان کے جان ومال کی حفاظت ونگہداشت کی کوئی ضمانت نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ اسلام قبول نہ کرے۔ پس کافر عظمت وانسانی کرامت کا حامل نہ ہوگا۔ اس کی جان ومال حرمت کے دائرہ سے خارج ہوگی۔ لہٰذا اسے اسلام قبول کرلینا چاہئے یا جزیہ ادا کرنا چاہئے ورنہ اس کو قتل کردیا جانا چاہئے اس کے علاوہ اسلام میں کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔ اس حکم کی دلیل قرآن مجید میں موجود آیات جہاد اور رسول مقبول سے منقول یہ روایت ہے:

'' مجھ کو اس کام کے لئے تعینات کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں تاوقتیکہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمد کی نبوت کی شہادت دینے لگیں، نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ اگر ان لوگوں نے ایسا کردیا تو ان کی جان ومال کو حرمت حاصل ہوجائے گی۔ کسی شخص کو دین اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کے خلاف ظلم وجبر سے کام لیا جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص دین اسلام میں داخل نہیں ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ جزیہ ادا کرے اور اگر ایسا نہ کیا تو تلوار اس کی جزا ہوگی کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ'' جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں ان سے جنگ کرو۔ نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دین اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا پیرو ہے تو اس کی جان ومال کو حرمت حاصل نہ ہوگی۔'' سلفی تحریک سے وابستہ افراد کا عقیدہ وایمان ہے کہ قرآنی آیات میں دعوت اسلامی کے سلسلے میں جبرواکراہ سے کام لینے کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ ان آیات کا تعلق قبول اسلام کی اصل سے ہے یعنی اہل کتاب کے لئے اسلام قبول کرنا لازمی

نہیں ہوگا بلکہ انہیں جزیہ ادا کرنا پڑے گا۔

## ایجابی راہ وروش

کہا گیا کہ ادیان کے درمیان گفتگو کے موضوع پر ان لوگوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے جو اس گفتگو کی حمایت وطرفداری کرتے ہیں اور اس کے انسانی پہلوؤں کی ترویج میں ہمہ تن سرگرم ہیں اور اس کے مقاصد اور گہرے نتائج کے بارے میں مشکوک اور اس کے شرمناک مقاصد کی اعلانیہ تردید کرتے ہیں۔ جولوگ ایجابی راہ وروش سے اس موضوع کی طرف نگاہ کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مختلف ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والے لوگ مذاہب کے درمیان موجود مشترکہ عقائد پر بھروسہ کرتے ہوئے آپس میں گفتگو کرسکتے ہیں۔ انہیں ادیان کے درمیان موجود اختلافی امور کی طرف زیادہ توجہ نہ دینی چاہئے۔ دوسری طرف دین اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرم عمل قرار دینے والے گروہ سے وابستہ اسلامی راہ وروش کے علمبرداروں کا یہ خیال ہے کہ انسان کی ذاتی زندگی ہو یا معاشرتی زندگی اس کو ہر شعبۂ حیات میں اسلامی احکام کی پیروی کرنی ہے۔ اس جماعت کا اس گروہ سے گہرا اختلاف ہے جو سیکولر نظریہ کے حامل اور دین کو انسان کی ذاتی زندگی کے دائرہ میں محدود قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں گروہ، آپسی مشترکات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس الحادی جماعت کا متحدہ طور پر ڈٹ کر مقابلہ کرسکتے ہیں جو دین ومذہب کے بنیادی مخالف ہیں۔ لہٰذا مختلف ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والے لوگ انسان کی سماجی زندگی میں دین کے کردار کے سلسلہ میں مشترک ایمان واعتقاد رکھنے والے گروہ آپس میں بات چیت کرسکتے ہیں۔

## اصول اربعہ

عالمی انسانی معاشرہ نے گذشتہ صدی میں دوعالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا اور دنیائے بشریت نے ان جنگوں کے دوران یہ تجربہ حاصل کیا کہ انسانی معاشرہ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مدمقابل کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے کسی قسم کے ٹکراؤ کے بجائے اسکے ساتھ صلح آمیز باہمی زندگی کا رویہ اختیار کرے۔ ان مکتب فکر کی حمایت کرنے والے دانشوروں کا خیال ہے کہ موجودہ عالمی ماحول میں ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمہ سے قبل سیاست کے میدان میں دین کا کوئی کردار نہیں تھا لیکن دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کے ختم

ہوتے ہی سیاست کے میدان میں دین نے نہایت اہم کردار انجام دینا شروع کردیا ہے اور موجودہ زمانہ میں دنیا کے اکثر سیاسی ماہرین نے مذہبی شخصیتوں کی حمایت وسرپرستی کے سایہ میں اپنی سرگرمیوں کو غیر معمولی وسعت دے رکھی ہے۔ اس اہم بات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اگر کوئی ملک اس میدان میں داخل نہیں ہوتا ہے تو یقیناً اسے زبردست خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ پس دنیا کی موجودہ صورتحال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو ضروری ہے پس یہ دیکھنے کے بعد ہرگز تعجب نہ ہوگا کہ مختلف بین الاقوامی تنظیمیں اور ادارے اس مکتب فکر کی حمایت وسرپرستی میں بھاری بجٹ اور عظیم مالی سرمایہ لگانے کے لئے ہم تن آمادہ ہیں۔

لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر گفتگو کا بنیادی معیار مشترکہ پہلوؤں کی موجودگی ہے تو پھر اس گفتگو کا دائرہ صرف ادیان ومذاہب کی سرحدوں تک ہی کیوں محدود رہ جائے بلکہ اصول وحقائق اربعہ یعنی حقیقت، عدالت، آزادی وکرامت کو اس گفتگو کا بنیادی معیار کیوں نہ قرار دیا جائے جو تمام بنی نوع انسان مثلاً مومن وملحد ہی نہیں جماعت انس وجن کے درمیان بھی مشترک ہیں اور تمام لوگ اس بات سے اپنی ہم خیالی کا اظہار کرسکتے ہیں۔ اس بات کو فقط ادیان ومذاہب کے درمیان محدودیت کو ایک طرح کی انحصار پسندی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم خواہش وہی ''عالمی اخلاق'' ہے جس کو فراماسونری افراد بھی قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اس بات کو بنیاد قرار دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ دنیا کو ایک ''جدید فراماسونری نظریہ'' کی ضرورت ہے جو خود کو مذاہب کے دائرہ سے نجات فراہم کرتے ہوئے درج ذیل چار اصولوں کی بنیاد پر ایک جدید عالمی انسان معاشرہ کی تشکیل کا کام انجام دے سکے۔

## وابستگی حقیقت

مجموعی اعتبار سے مذاہب کے درمیان گفتگو کے خیال کو وابستگی حقیقت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے کیونکہ ہر مذہب میں حق کی شعائیں پائی جاتی ہیں۔ پس اس گفتگو کو حق وحقیقت سے منسوب کردینے کے بعد اس میں غیر معمولی معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔ سرزمین مغرب میں نسبیت اور وابستگی کے اس نظریہ کے منظر عام پر رونما ہونے کے بعد ''جان ہیک'' جیسے بعض عیسائی دانشوروں کو اس بات کے

لئے مجبور ہونا پڑا کہ وہ اس نظریہ اور عیسائیت کے بنیادی اصولوں کے درمیان مطابقت قائم کریں۔

نظریہ نسبیت یاوابستگی کی پیروی کرنے والے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اخلاقی قدریں اور دینی افکار و عقائد ذاتی حالات مختلف اور معاشروں کی خصوصیات سے وابستہ ہوا کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی امر مطابق یا مخصوص کا م ارزش وحقیقت کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر جب ہم مذہبی اعتقادات کی بات کرتے ہیں تو وہ ان نسبی امور سے آگے یا الگ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس پر ایمان واعتقاد رکھنا لازمی ہو یا جس کے بارے میں لوگ تعصب سے کام لیں کیوں کہ یہ امور نہ اس درجہ حق ہیں اور نہ باطل کہ ہم دوسرے عقائد کے وجود سے پریشان ہو جائیں۔

اس استدلال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ تمام عقائد افراد اور معاشروں کے ساتھ اپنی وابستگی کی وجہ سے درست ہیں لہٰذا ہم لوگوں کو ان تمام افکار وعقائد کا احترام کرنا چاہئے جبکہ مذہبی صبر وتحمل یا مذاہب کے درمیان گفتگو کی بات سے ایسے موقع پر پیش کی جاتی ہے کہ وہ شخص اپنے دینی اعتقادات کی صداقت وحقانیت پر مکمل اور بھر پور ایمان واعتقاد رکھتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ دوسرے کے دین کو پوری طرح باطل سمجھنے میں ذرہ برابر شک یا ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتا ہے پھر بھی وہ اس عقیدہ کے حامل کے ساتھ بردباری اور رواداری سے کام لیتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے۔

اس سلسلے میں مصطفیٰ ملکیان اس خیال کے حامل ہیں کہ بیشک اگر میرا اعتقاد وایمان یہ ہے کہ میرا دین حق کا مجسمہ ہے اور دنیا کے تمام دوسرے ادیان باطل ہیں تو ایسی صورت میں آپسی گفتگو کو کوئی امکان باقی نہ رہ جائے گا۔ ادیان ومذاہب کی درمیان گفتگو بنیادی طور پر اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب کہ میں اپنی ذات اور جس سے گفتگو ہونی چاہئے دونوں کو حق وباطل کا مجموعہ تصور کریں اور یہ باور کریں کہ میں اور میرا مد مقابل دونوں میں سے کوئی بھی نہ حق مطلق ہے اور نہ باطل مطلق۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہوگی اور گفتگو کا دروازہ بالکل بند ہوجائے گا یا یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گفتگو کا دروازہ نہ کھل سکے گا۔ پس اگر ہم واقعی اس بات کے لئے پوری طرح آمادہ ومائل ہیں کہ ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کا اہتمام کیا جائے تو بات اس وقت ممکن نہیں ہے جب تک اپنے بعض دعووں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ہم خود کو اپنے مد مقابل دونوں کو حق وباطل کا مجموعہ تصور کریں۔[۳] دوسرے لفظوں میں ہم اس اعتقاد کے حامل بن جائیں کہ ہم میں اور ہمارے

۳۔ ملکیان، مصطفیٰ (گفتگو)، ''مدارا، گفتگو و دین'' گزارش گفتگو (ماہنامہ)، سال اول، ۹:۱

مد مقابل میں سے کوئی بھی نہ حق مطلق ہے اور نہ باطل مطلق ۔ لیکن اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا یا اس گفتگو کا سلسلہ شروع ہی نہ ہوسکے گا۔ پس اگر ہم واقعی اس بات کی طرف مائل ہوں کہ ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو ضرور ہونی چاہئے تو پھر ہمیں اس اعتقاد کا حامل ہونا پڑے گا کہ ہم لوگ جس اعتقاد کے حامل ہیں وہ درحقیقت حق وباطل کا مجموعہ ہے جبکہ اس کے برعکس محمد لگنھاؤں کا عقیدہ وایمان یہ ہے کہ یہ مظاہرہ کرنا کہ تمام ادیان برابر ہیں ایک بیہودہ اور ادیان کی تعلیمات کے برعکس ہے۔ ہم لوگوں کو ایک دوسرے کے سلسلے میں ادیان ومذاہب کے انحصار گرانہ دعووں کو تسلیم کرتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہم ان امور کی حدود سے آگے بڑھ کر بھی کام کر سکتے ہیں۔ انحصار گرائی کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہوا کرتا کہ دیگر ادیان ومذاہب کے مقابلے میں اپنے دین کی حقانیت مطلقہ کے ساتھ ہی ساتھ ان ادیان سے گفتگو کی تردید کی جارہی ہے۔ [۴]

## دوسروں کے عقائد کا احترام

عمومی محاورات اور سیاسی مباحثات میں ہمیشہ یہ بات مسلمہ طور پر تسلیم کرلی جاتی ہے کہ دوسروں کے مذہبی عقائد کا احترام کیا جانا چاہئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو باطل اور نادرست مانتے ہوئے اس کا احترام کیسے کیا جائے؟ یہ بات تو مغربی اقدار کی ایک اہم خوبی بنا کر پیش کی جاتی ہے کہ یورپ والے اپنے مخالفین کے عقائد کا بھی احترام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک ہندو عبادت گاہ میں ملکہ برطانیہ کی حاضری اور مندر میں موجود مذہبی علامتوں اور نمونوں کے احترام کی داستان کو اس افتخار آمیز عمل کے گواہ کی حیثیت سے نقل کرتے ہیں۔ درحقیقت اس موضوع کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دو باتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا جائے ۔ ان میں سے ایک بات کا تعلق دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام سے ہے اور دوسری بات دیگر مذاہب کے عقیدوں کو برا تصور کرتے ہوئے اس کی بے احترامی کرنا ہے ۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عقیدہ کو غلط اور باطل خیال کرتا ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس پر یہ فریضہ عائد کردیا گیا ہو کہ وہ اس باطل عقیدہ کا احترام بھی کرے تو یقیناً یہ ایک ناپسندیدہ فریضہ ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں وہ صرف نفاق سے

۴۔ لگھناوزن، محمد، "میل صادقانہ بہ ایجاد تفاہم" گزارش گفتگو (ماہنامہ)، سال اول، ۲۱:۱

کام لیتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف عمل انجام دے سکتا ہے یا ایک ماہر فنکار وصاحب ہنر کی طرح اپنے کردار کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ ایسے کردار کو انجام دینے میں غیر معمولی مہارت کے حامل رہے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں درست راہ وروش اور منطقی شیوہ وطریقہ یہ ہے کہ اس شخص سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ کسی عقیدہ کو باطل اور نادرست جانتے ہوئے بھی اس عقیدہ کے حامل شخص کے سلسلے میں صبر و تحمل اور رواداری سے کام لیتے ہوئے اس شخص کو اس مخصوص عقیدہ سے وابستگی کے لئے معذور سمجھا جائے جس کا منطقی نتیجہ یہ بر آمد ہوتا ہے کہ دوسروں کے مذہبی عقائد کی بے احترامی خود بخود ممنوع ہوجاتی ہے۔ یعنی اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں کام انجام نہ دے جبکہ دوسروں کے مذہبی عقائد کے احترام کو واجب قرار دیتے ہوئے اس سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف وہ فلاں کام انجام دے جو ریاکاری اور منافقت کی طرف راغب کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین کے باطل عقیدہ اور خرافاتی اعمال کے سلسلے میں انہیں گالی دینے یا اذیت پہونچانے سے منع تو کیا گیا ہے لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے باطل اور خرافاتی اعمال کا احترام کیاجائے۔'' وَلَاتَسُبُّو الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوْا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ، كَذَالِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن۔''(سورہ انعام۔۱۰۸) یعنی اے مومنو! ان لوگوں کو گالی مت دو جو غیر خدا کو پکارتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی جہالت ونادانی کی وجہ سے وہ لوگ خداوند عالم کو گالی دینے لگیں۔ ہم نے ہر آدمی کے اعمال وکردار کو ان لوگوں کی نظر میں زینت دے رکھی ہے۔ بارگاہ عالیہ خداوندی میں ان لوگوں کی واپسی کے وقت ان لوگوں کو ان کے کردار واعمال کی طرف ہم متوجہ کردیں گے۔

## محدود اور بامقصد راہ روش

اکثر مسلمانوں نے ادیان کے درمیان گفتگو کو مسلمانوں کی راہ وروش میں تبدیلی پیدا کرنے والے بامقصد منصوبے سے تعبیر کیا ہے۔ ان لوگوں نے اس موضوع کا استقبال نہیں کیا اور اس میدان میں داخل ہونے کے سلسلے میں احتیاط سے کام لیا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اس عمل کو نمایاں سیاسی مقصد تک رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ خیال کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر عراق کے نامور فقیہ

مرحوم شیخ محمد حسین کاشف الغطاء نے لبنان میں منعقد ہونے والی'' بجمدون'' کانفرنس کی اعلانیہ تنقید فرمائی تھی۔ یہ کانفرنس ۱۹۵۴ میں لبنان کے شہر بجمدون میں منعقد کی گئی تھی جس میں مسلمان اور عیسائی مذہبی علماء کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور جس کا مقصد اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کی روک تھام کے لئے مذہب کو ایک اہم وسیلہ کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ انھوں نے ۱۹۵۰ کی دہائی میں مشرق وسطی میں موجود ماحول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس کانفرنس کی تشکیل کو مشکوک قرار دیا تھا کیونکہ اس زمانہ میں امریکہ اور برطانیہ اپنی سلامتی کو قائم رکھنے کے لئے مشرق وسطی کے ملکوں کو ڈھال کی حیثیت سے استعمال کررہے تھے۔ ۱۹۴۶ میں برطانیہ نے علاقائی سلامتی ڈھانچہ تیار کیا تھا اور ۱۹۵۵ میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک سلامتی معاہدہ ہوا جس میں ایران پاکستان اور برطانیہ بھی شامل تھے۔ اس کو معاہدہ بغداد کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مرحوم کاشف الغطاء نے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول نہیں کی اور'' المثل العلیا فی الاسلام ، لافی بجمدون'' عنوان کے تحت ایک مقالہ میں بڑی طاقتوں کے مفاد ومصالح کے لئے دین کے استعمال کو ناجائز قرار دیا۔ ۵

## دینی تعلیمات

ادیان کے درمیان گفتگو کی تیسری روش محدود ور بامقصد گفتگو کی راہ و روش ہے۔ قرآن مجید آج سے چودہ سو سال قبل آسمانی کتب کی پیروی کرنے والوں کو گفتگو ومناظرہ کی دعوت دے چکا ہے اور آج صاحب نظر لوگ مذہبی اور دینی مفکرین اور دانشمندوں کے درمیان افہام وتفہیم کی تبلیغ واشاعت کے لئے ، الٰہی ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والوں کے درمیان آپسی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے نیز مختلف ادیان کی پیروی کرنے والوں کے درمیان کیوں اور کیسے کا جواب فراہم کرنے کے لئے اس کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے ساتھ گفتگو کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَاباً مِنْ دُونِ اللّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا

۵۔ کاشف الغطاء، محمد حسین،'' المثل العلیا فی الاسلام لا فی بجمدون'' ص ۳۳۔۳۱

بِاَنَّا مُسْلِمُونَ۔" (سورہ آل عمران۔ ۶۴)

یعنی کہدو کہ اے اہل کتاب آؤ اور جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان ایک جیسی ہے اس پر ثابت قدم ہوجائیں تا کہ خدا کے علاوہ کسی غیر خدا کی عبادت نہ کریں...''

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اور اسی کو سند قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کی نظر میں بامقصد اور تعمیری گفتگو ہی مختلف ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والوں کے درمیان سالم اور عاقلانہ تعلقات کی تشکیل کا واحد راستہ ہے۔'' ... وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ (سورہ النحل آیت ۱۲۵) یعنی بہترین راہ وروش سے ان لوگوں سے مباحثہ کرو۔'' وَلَاتُجَادِلُوا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ اِلاَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا اٰمَنَّا بِالَّذِي اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (سورہ عنکبوت ۴۶)۔" اور اے مسلمانو! تم لوگ اہل کتاب کے ساتھ بہترین راہ وروش سے مباحثہ کرو اس کے علاوہ کوئی دوسری روش اختیار نہ کرو۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان علماء نے تنظیم اسلامی کانفرنس کے اجلاس کے دوران مکہ مکرمہ میں تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے لئے ایک عالمی مرکز بنانے پر زور دیا کیوں کہ تمدنوں اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو ان مشترک بنیادی اصولوں پر ہی کی جاسکتی ہے جس کی بنیاد اعلیٰ انسانی قدروں پر قائم ہو اور جو عالمی سطح پر صلح وسلامتی قائم کرنے میں مدد ومعاون ہو۔

اسلام نے گذشتہ انبیاء علیہ السلام پر اعتقاد وایمان کو لازم قرار دیا ہے اور ان کے درمیان کسی قسم کے فرق کا قائل نہیں ہے۔ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍمِنْ رُسُلِهِ۔'' اور ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہم پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے سلسلے میں فرق نہ ڈالیں۔" اِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُونَ۔" (سورہ بقرہ آیت ۶۲)

یعنی اس میں کوئی شک نہیں..... دنیا میں رنجیدہ وغمناک نہ ہوگا۔''

لیکن بعض مفکرین کا یہ خیال ہے کہ ہماری مستند دینی کتابوں میں اہل کتاب کے ساتھ گفتگو کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ موجودہ زمانہ میں ادیان کے درمیان مطلوبہ گفتگو سے بالکل مختلف ہے۔ اس دعوت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جن حقائق اور اصولوں پر ہم لوگوں کا مشترکہ اعتقاد وایمان

ہے ان کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ہم لوگوں کو ان مسائل کے بارے میں بھی بحث و مباحثہ (Debate) کرنا چاہیئے جن پر ہمارا اختلاف ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہم میں کون حق پر ہے اور کون باطل کی پیروی میں لگا ہوا ہے جبکہ جس گفتگو (Dialogue) کی طرف آج اشارہ کیا جارہا ہے اس کا مقصد مشترکہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے مشترکہ کوشش ہے جس کے ذریعہ مختلف ادیان و مذاہب اور تہذیب وتمدن کے سابقہ اور آزمودہ تجربوں کو بروے کارلاتے ہوئے موجودہ مسائل کا کامیاب حل تلاش کیا جاسکے۔

## امام صدر کا بنیادی اصول (doctrine)

گفتگو اور تعایش'' کے سلسلے میں امام صدر کے نظری بنیادی اصولوں کی پیروی اور اس کی کامیابی کے اسباب وعوامل کے تجزیہ کے بعد ایسی سنجیدہ اور ہمہ جہتی کوشش لازمی ہوجاتی ہے جس نے حالیہ چند برسوں کے دوران ایران اور عرب کے اکثر مسلمان دانشوروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کررکھی ہے۔ اس مقالہ میں جو کچھ اشارہ وار بیان کیا جارہا ہے وہ تین بنیادی اور اہم محور ہیں جن سے اس پر حاکم روح کی جھلک محسوس کی جاسکتی ہے۔

## ا۔ مسلمانوں کی عزت کی بحالی

امام صدر نے ۶۰ اور ۷۰ کی دہائیوں کے دوران لبنان میں ''گفتگو اور تعایش'' کی تشکیل وہدایت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھال رکھی تھی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مذہب اسلام کے بنیادی اصولوں سے ذرہ برابر انحراف نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس وہ مسلمانوں کی عزت و آبرو کی بحالی میں کامیاب بھی رہے جنہیں لبنان میں گذشتہ تین صدیوں سے دوسرے اور تیسرے درجہ کا شہری قرار دیا جاتا تھا لیکن امام صدر کی کوشش و رہنمائی نے ان مسلمانوں کو لبنان کے عیسائی باشندوں کے برابر کھڑا کردیا۔ ۱۹۶۹ میں مجلس اعلائی اسلامی شیعہ کی بنیاد رکھی گئی اور لبنان کے عیسائی باشندوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ اس سے اس مقصد کی گواہی حاصل ہوجاتی ہے جس کی طرف بیروت میں واقع امریکی سفارت خانہ نے اپنی رپورٹ میں واضح اشارہ کیا ہے۔

لبنان کے عیسائی رہنما اس مجلس کی تاسیس وتشکیل سے بہت خوش ہیں۔ وہ لوگ یہ اٹل ارادہ رکھتے ہیں کہ وہ اس تحریک کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ موجودہ صورت حال لبنان کے عیسائی معاشرہ

میں آقای صدر کی مقبولیت اور نمایاں حیثیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

## ۲۔ دیگر مذاہب کے لوگوں میں معنویت کا تعارف

امام صدر نے ''گفتگو اور تعایش'' کے دوران نہ صرف اسلام کی عقل دوستی وخرد پسندی کو پوری طرح واضح اور نمایاں کردیا بلکہ ان لوگوں کے درمیان عشق خداوندی اور پاکیزگی نفس کی ایسی تبلیغ کی کہ عیسائی عبادت خانوں میں معنویت اور عرفانیت کا چرچہ جاری ہوگیا۔ امام صدر نے لبنان کے مختلف علاقوں میں واقع عیسائی گرجا گھروں مثلاً ''دیر المخلص'' ''کبوچیہ'' اور ''مارمارون'' نامی عیسائی عبادت گاہوں میں اپنی شرکت اور پرمغز تقریروں کے ذریعہ یہ اہم کارنامہ انجام دیا۔

## ۳۔ انسان کی خدمت

مختلف ادیان ومذاہب کی پیروی کرنے والے لوگوں کے درمیان تعاون اور دوستی کو امام صدر موجودہ لبنان اور آنے والے دور میں پوری دنیای بشریت کے لئے ایک ایسی اہم ضرورت تصور کرتے تھے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے موجودہ زمانہ میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے مسائل کو حل کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور اس سلسلے میں انہیں لبنان کے عیسائی عوام اور دینی رہنماؤں کا بھرپور تعاون حاصل تھا جس کا شاندار مظاہرہ حرمان کے خلاف تحریک المحرومین، تقسیم کے خطرہ کا خاتمہ اور جنگ کی آگ کے سرد پڑجانے جیسے اہم موقعوں پر دکھائی دیتا ہے۔

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ کو رونما ہونے والے حادثہ کے بعد'' خاتمہ تاریخ '' اور تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤں'' جیسی کتابوں کے مصنف ہنٹینگٹن اور فوکویاما جیسے نامور دانشوروں سمیت امریکہ کی ۶۰ علمی اور ثقافتی شخصیتوں نے عالم اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے ایک اہم مکتوب جاری کیا جس کا عنوان تھا'' ہم کیوں اور کس چیز کے لئے جنگ کررہے ہیں۔''؟

ان دانشوروں نے جنگ طلبی کی سیاست کی پاکیزگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امریکی قدروں کو ہی مطلق عالمی انسانی قدروں کے نام سے تعبیر کیا اس بیان پر دستخط کرنیوالوں میں Samuel Huntington بھی شامل ہیں جس نے تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ اپنے بیان میں لکھتے ہیں کہ مغربی تمدن دنیا کے دیگر تمدنوں سے بالکل مختلف ہے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس کو غیر معمولی وسعت حاصل ہے بلکہ اپنی ممتاز اور نمایاں قدروں کی وجہ سے اسے جدیدیت

modernism کی پرچمداری حاصل ہوگئی ہے تاکہ وہ ان قدروں کو ساری دنیا میں پھیلا سکے۔[۶]

انسانی حقوق کے عالمی نظریہ کی طرفداری کرنے والوں کا اعتقاد وایمان ہے کہ مغربی قدریں، مغربی ادارے اور تنظیمیں اور ان کی مغربی ثقافت سب سے زیادہ روشن، آزاد، منطقی، مہذب اور جدید ترین انسانی فکر کی حامل ہے ان لوگوں کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ عالمی عوام کو چاہئے کہ وہ ان اعلیٰ اور معیاری قدروں اور مغربی تہذیب وتمدن کے اصولوں کو قبول کرلیں۔

اسی وجہ سے یہ لوگ مغربی تہذیب کو عالمی رنگ وروپ دینے میں ہمہ تن سرگرم ہیں تاکہ یہ تہذیب پوری دنیا پر چھاجائے۔

ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کی تحریک اور اس کی حمایت وطرفداری کرنیوالے اکثر افراد اس موضوع کی طرف عملی راہ وروش اور Pragmatic نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں لہٰذا وہ لوگ اس بات کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ یہ تحریک کن فکری اور فلسفیانہ بنیادی اصولوں پر قائم ہے بلکہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دورحاضر کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مختلف ادیان ومذاہب کی صلاحیتوں کو استعمال کیاجاسکتا ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو کا مطلب ومفہوم یہ ہے کہ موجودہ عالمی انسانی سماج مختلف النوع ایسے مسائل میں گرفتار ہے جو یقیناً بین الاقوامی پہلو کے حامل ہیں لہٰذا عالمی انسانی برادری میں شامل مختلف معاشرے اپنے اعتقادات کے بموجب ان مسائل کا مختلف حل دنیا کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔[۷]

لیکن یہ بات بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ گفتگو اسی وقت مفید وموثر ثابت ہوگی جب گفتگو میں شریک افراد اس کے مفہوم اس کی وسعت اور اس کے اغراض ومقاصد کے بارے میں متفقہ خیال کے حامل ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادیان اور تہذیبوں کے درمیان گفتگو کی بات چھیڑتے وقت اس سلسلے میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا ہے کیونکہ موجودہ شواہد کی روشنی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام اور مغربی دنیا کے درمیان اہم ترین ٹکراؤ کی صورت حال ہے کیونکہ مغربی ماہرین سیاست اور ان کے ساتھ ہی ساتھ مغربی مفکرین اپنی تہذیبی قدروں کو دنیا کے سامنے اس انداز میں پیش کررہے ہیں کہ دنیا کی دوسری قوموں کے لئے یہ واجب ہے کہ وہ مغربی ثقافت اور ان کی تہذیبی قدروں کو

۶۔ لماذا تقاتل؟... رسالة من مثقفي امريكا إلى العالم الإسلامي، مجلة العالمية

۷۔ ملکیان، مصطفیٰ (گفتگو)، ''مدارا، گفتگو ودین'' گزارش گفتگو (ماہنامہ)، سال اوّل، ۹:۱، صص ۱۲۔۱۱

اپنا لیں اور اس سلسلے میں ذرہ برابر کوئی سوال نہ کریں ۔ پس مختلف ادیان ومذاہب اور تہذیب وتمدن کے درمیان گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ مختلف معاشروں کے کچھ مفکرین اپنے مقصد کو مغربی تہذیب کے معیار واقدار کے مطابق اور اس کے سانچے میں ڈھال لیں تاکہ وطن دوستی کا فریضہ بھی ادا ہوجائے ۔ واضح رہے کہ ایک مدت سے اس پر وجیکٹ کو عملی رنگ وروپ دینے کے لئے سیاسی اور فوجی سرگرمیاں جاری ہیں اور وطنیت کے سانچے میں ڈھلنے کے بعد ممکن ہے کہ اس کے منفی پہلوؤں میں قدرے کمی پیدا ہوجائے اور جو بات پہلے سے تسلیم کی جاچکی ہے وہ اتفاق رائے سے عملی جامہ اختیار کرلے۔

واضح رہے کہ ادیان ومذاہب اور تہذیبوں وتمدنوں کے درمیان حقیقی اور صادقانہ گفتگو اسی صورت میں عملی رنگ وروپ اختیار کرسکتی ہے جب گفتگو میں شریک ہر جماعت اپنے اعتقادات اور اپنی قدروں پر ٹھوس اعتقاد کی حامل ہو۔ پس محمد لگنھاوزن کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ دینی اعتقادات کی فضیلت مطلقہ ادیان ومذاہب کے درمیان گفتگو میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میں ان لوگوں کی اس بات سے قطعی متفق نہیں ہوں بلکہ میں یہ سوچتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی دیگر ادیان ومذاہب کے ساتھ ایک ثمر بخش اور سود مند گفتگو کا سلسلہ شروع کردینا چاہے اور گفتگو میں شریک لوگوں کو دوسرے لوگوں کے مذہبی عقائد پر کسی قسم کی کوئی فضیلت دبالادستی حاصل نہ ہونی چاہئے بلکہ سب اپنے مذہبی اعتقادات کو پوری طرح عزیز رکھیں۔ ۸

بہر حال اس تحریک گفتگو کو سودمند بنانے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اس کے اغراض ومقاصد پہلے سے معین ہوجائیں اور صرف عالمی انسانی برادری کے مفاد ومصالح کو ہی نگاہ میں رکھا جائے اگر صادقانہ طور پر اس گفتگو کے مقاصد کا تعین ہوجائے تو اس تحریک کے خفیہ مقاصد کے سلسلے میں عالمی برادری میں جو غلط فہمی ہے وہ دور ہوجائے اور لوگوں کو یہ یقین ہوجائے کہ کسی ایک تہذیب کو مختلف وطنی رنگ وروپ میں عالمی برادری پر مسلط کرنے کا منصوبہ کارفرما نہیں ہے۔

---

۸۔ ایضاً۔ ۵